IJCRT.ORG ISSN : 2320-2882

INTERNATIONAL JOURNAL OF CREATIVE RESEARCH THOUGHTS (IJCRT)

An International Open Access, Peer-reviewed, Refereed Journal

اردو افسانہ میں فرقہ وارانہ فسادات کا المیہ

عنایت اللہ انصاری
Assistant Professor
Urdu department
R.B.G.R Collage
Mahrajganj, Siwan, Bihar

برصغیر ہندوپاک کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انگریزوں کی حکمرانی سے قبل بر صغیر کے عوام میں مذہبی اعتبار سے کبھی کوئی اختلاف نہ تھا۔ البتہ حکومتی سطح پر ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے درمیان متعدد خوں ریز معرکے ہوئے۔اور یہ بات بھی بڑی حیران کن ہے کہ ان معرکوں میں ہندو حکمرانوں کی جانب سے جہاں ہزاروں مسلمان سپاہی مصروفِ جنگ تھے وہیں مسلمان بادشاہوں کی طرف سے لڑنے والوں میں لاکھوں ہندو فوجی تھے۔ مشہور مؤرخ ”رجنی پام دت“ رقم طراز ہیں:

”انگریزوں سے پہلے مختلف بادشاہوں میں لڑائیاں ہوتی تھیں اور یہ بادشاہ بھی ہندو یا مسلمان ہوتے تھے لیکن ان لڑائیوں نے کبھی بھی ہندو مسلم لڑائی کی شکل اختتار نہیں کی۔ مسلمان حکمراں بڑے بڑے عہدوں پر ہندوؤں کو رکھتے تھے اور ہندو حکمراں مسلمانوں کو بڑی بڑی خدمتیں سپرد کرتے تھے۔ 1ـــ“

عوامی سطح پر مذہبی اعتبار سے تفریق خالص انگریزوں کی پیدا کردہ ہے۔ اوراس بات کا اعتراف خود ایک انگریز ”سرجان مینارڈ“ سابق ممبر انتظامی کونسل پنجاب نے کچھ اس طرح کیا ہے۔

”ہندو اور مسلمانوں کے درمیان عام مخالفت عہد برطانیہ میں شروع ہوئی۔ 2ـــ“

اس تفریق کو پیدا کرکے انگریزآخر کیا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا؟ اس بات کا تجزیہ کرتے ہوئے ”سرجان میلکم“ لکھتے ہیں:

”اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی بڑی حمایتیں ہیں ان میں عام تقسیم ہو اور پھر ایک حمایت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں، فرقوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اسی طریقے سے جدا رہیں گے اس وقت تک یہ لوگ کوئی بغاوت اٹھاکر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہیں کرسکیں گے۔“

چنانچہ انگریزی حکومت نے اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف سطح پر کام کئے اوراس میں سب سے پہلا کام ”مسلم دور حکومت“ کی غلط تاریخ مرتب کرنا تھاجس میں مسلمانوں کو ظالم اور ہندوؤں کو مظلوم ثابت کیا گیا اورتاریخ نویسی کا یہ کام ایک انگریز مصنف ”مسٹر ایلیٹ“ نے اپنے ذمہ لیا۔ جس نے اپنی ہر تصنیف میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ”مسلمانوں کا عہد حکومت ہندوؤں کے لئے ظالمانہ تھا اور انگریزوں کی حکومت ان کے لئے رحمت الٰہی ہے۔۴ـــ“

اس کے علاوہ 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں کو مخصوص طورپر اپنے عتاب کا شکار بنانا شروع کیااور ہندوؤں کے پڑھے لکھے طبقے اور تاجر قسم کے افراد کوملازمین اور دیگر مراعات سے نوازنے لگے۔ جس کے سبب مسلمانوں میں کم ہمتی اور مایوسی پیدا ہوگئی نیز انہیں ہندوؤں کے تئیں رقیبانہ جذبہ بھی پیدا ہوا۔ لیکن جب سرسید احمد خاں کی کوششوں کی بدولت انگریزی پالیسی نے پلٹا کھایا اورمسلمانوں کو بھی سرکاری ملازمتیں اور دیگر مراعات ملنی شروع ہوئیں تو اسے بھی انگریزوں نے اپنی تفریق کی پالیسی کے لئے استعمال کیا۔ چنانچہ اب جب کہ انھوں نے مسلمانوں کو نوازنا شروع کیاتو ساتھ ہی ساتھ ہندوؤں کو نظر انداز بھی کرنے لگے۔ ان حالات کے سبب ہندوؤں کے دلوں میں آہستہ آہستہ یہ بات گھر کرنے لگی کہ مسلمان ان کے حقوق کے غاصب ہیں۔جیساکہ ایک مسلمان مفکر ”مولانا سید طفیل احمد منگلوری“ فرماتے ہیں:

”ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف ملازمتوں کو لے کر بھی ہوا۔ ابتداً غدر کے بعد انگریزوں نے ہندوؤں کو خاص طورپر اعلیٰ عہدوں پر ملازم رکھا اور مسلمانوں کو بہت حدتک الگ کردیا۔ مگر جب دوبارہ

مسلمانوں کو انگریزوں نے مصلحتاً پھر سے ملازمت میں لینا شروع کیا تویہ بات ہندوؤں کو بہت ناگوار گزری۔۵ ــ؎‘‘

ہندوؤں کی یہ ناگواری کچھ اس قسم کی تھی ۔ ملاحظہ ہو مشہور مؤرخ بتمبھر ناتھ پانڈے کا یہ بیان:

’’1872ء کے بعد انگریزوں کی سیاست بدل گئی۔ مسلمانوں کو سرکار کی چہیتی بیوی اور ہندوؤں کو سوکن کا درجہ ملا۔۶ ــ؎‘‘

اور اس طرح جب ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپسی اعتماد متزلزل ہوا اورجب دونوں ہی فرقے ایک دوسرے سے بدگمان ہونے لگے تو انگریزوں نے اسے اور ہوا دینا شروع کیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر غلام ذوالفقار حسین کا خیال ہے:

’’بعض آرایہ سماجی رہنماؤں کو جو جیلوں میں بند تھے انھیں مخصوص اغراض کے تحت رہا کر دیا گیا۔ ان آریہ سماجی رہنماؤں نے جیل سے نکلتے ہی بڑے دل آزار طریقے سے شدھی اور سنگٹھن کی تحریک شروع کردی۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی تبلیغ اور تنظیم کا سلسلہ شروع کردیا اور ملک بھر میں خوں ریز المناک فسادات کا بازار گرم ہوا جس کے تصور سے ہی رونگٹا کھڑا ہوجاتا ہے۔ 7 ــ؎‘‘

اورانیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں تو فرقہ وارانہ فسادات بڑے پیمانے پرشروع ہوگئے۔ بمبئی، کانپور،اعظم گڑھ، رنگون اور ملک کے دوسرے بڑے شہروں نے پہلی بار فرقہ وارانہ فسادات کے بھیانک چہرے کو دیکھامشہور اور نامور مؤرخ ڈاکٹر تاراچند فرماتے ہیں:

’’1818ء میں ملتان میں فسادہوا اوراس کے بعد کئی برسوں تک ملک کے مختلف حصوں میں دنگے ہوتے رہے۔ 1883ء میں اترپردیش، مدھیہ پردیش، بہار اور بمبئی میں فسادات ہوئے۔۸ ــ؎‘‘

پھر بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں جبکہ تقسیم بنگال کی مخالفت کی لہر، سودیشی اور برطانوی اشیاء کے مقاطعے کی تحریک زوروں پر تھی۔ بنگال میں بڑے پیمانے پر ہندومسلم فسادہوئے۔ ۴/مارچ 1970ء کو ’’کومیلا‘‘ میں ہندومسلم فساد ہوااور اس سلسلے کاسب سے بھیانک فساد جمال پور، ضلع میمن سنگھ میں ہوا۔ آہستہ آہستہ فرقہ وارانہ فسادات نے ملک کو پوری طرح سے اپنی جکڑ میں لے لیا۔ یہ جکڑ کچھ ایسی مضبوط ثابت ہوئی کہ اس سے مملکت ہند کو آج تک آزادی نصیب نہ ہوئی اور نہ ہی دور دور تک اس کی کوئی امید ہی نظر آتی ہے۔

ان حالات میں اردو افسانہ جس کی بنیاد ہی--- زندگی اوراس کے تعلقات پر استوار ہوتی ہے اور--- میں زندگی کی حقیقی تصویریں اورسماج کا جیتاجاگتا پیکر--- کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اس کا تخلیق کار بھلا کیسے--- رہ سکتا تھا۔ ویسے بھی افسانے کا فن زندگی سے نظریں بچانے کاکام نہیں بلکہ اس کے ذریعہ انسانیت کا درد، اس کے مسائل اوراس کی کامرانیاں سبھی کچھ پیش کرنے ہوتی ہیں۔ جیساکہ اطہرپرویز کا خیال ہے:

’’افسانہ انسان اوراس کے سماج کے اردگرد چکر لگاتا ہے اس لئے وہ سماج کے مسائل سے کترا نہیں سکتایہ بات اور ہے کہ افسانہ نگار اسے اپنے مخصوص زاویئے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔۹ ــ؎‘‘

اور مشہور نقاد ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق ’’ہمارے دور کا شہرآشوب انسانوں میں ہی لکھا گیا ہے۔‘‘ یہی سبب ہے کہ اردو افسانے کے فن پر مختلف جلتے ہوئے موضوعات کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں اوراردو افسانہ نگاروں نے واقعی افسانوں میں اپنے دور کا شہر آشوب لکھا ہے۔ لیکن اگر ہم اردو افسانہ نگاری کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ 1880ء کے بعد ہی برصغیر میں فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا مگر اردو میں اس بات کی ترجمانی کرنے والا پہلا افسانہ 1948ء میں کرشن چند کے ذریعہ تحریر کیا گیا۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی اس کا جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اردو میں فن افسانہ نگاری کی تاریخ کا ایک سرسری مطالعہ کریں۔

’’افسانہ کہانی کی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔ اس کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان میں نظم و نثر دونوں ہی اصناف جوں جوں ارتقاء کے مراحل طے کرتی گئی افسانہ بھی اس کے دوش بدوش اور منزل بہ منزل پروان چڑھتا رہا۔ اردو میں ابتداً اس کی کوئی منظم شکل تو نہ تھی البتہ یہ نظم و نثر دونوں میں اس وقت تک لکھا جاتا رہا جب تک کہ بدلے ہوئے حالات کے تحت نیا ادبی مذاق پیدا نہیں ہوگیا۔ حالات میں یہ تبدیلی اورادبی مذاق میں یہ تغیر دراصل مغرب سے استفادے کی مرہونِ منت تھی۔ بقول ممتاز شیریں:

’’ہمارے یہاں افسانے کی پیدائش اس وقت ہوئی جب ہمارے ادیب مغربی ادب کا زیادہ مطالعہ کرنے لگے اور اس سے مستفیض ہونے لگے۔ 11 ــ؎‘‘

اکثر محققین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ اردو زبان میں افسانے کی ابتدا کا دور بیسویں صدی کے آغاز سے ہے اورا ردو زبان میں لکھا جانے والا پہلا افسانہ سجاد حیدریلدرم کا ہے جیساکہ ڈاکٹر سلامت اللہ کا خیال ہے:

’’تاریخی اعتبار سے 1900ء میں ’معارف‘ علی گڑھ میں شائع ہونے والا اردو کا پہلا افسانہ سجاد حیدریلدرم کا تھا۔12 ــ؎‘‘

حالانکہ اس سے قبل کی عبدالحلیم شرر، پیارے لال آشوب، شیوبرت لال برمن، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، علی محمود اور حکیم یوسف وغیرہ نے انشائیہ نما افسانے لکھے تھے لیکن ان کے یہ افسانے کسی

روایت یا تحریر کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ البتہ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، اور بعد کو پریم چند نے انسانے کو گہرائی عطاکی۔

سجاد حیدریلدرم اور منشی پریم چند کے افسانے دو الگ الگ نقطۂ نظر اور دو مختلف نظریات کے تحت افسانے تحریر کئے۔ یلدرم نے تخیلی انداز نظر اور رومانی رجحانات کااثر قبول کیا تو منشی پریم چند نے حقیقت پسندانہ رجحانات کے تحت افسانے تحریر کئے اور یہ سلسلہ 1932ء تک کسی نہ کسی طریق پر جاری رہا۔

آگے چل کر مغربی افکار ونظریات اور مغربی ادب کے بڑھتے ہوئے اثرات نے اردو افسانے کے فن میں تنوع پیدا کیا اورفکر کو وسعت وگہرائی عطاکی جس کی بدولت نوجوان فنکاروں نے جدید تکنیک کی روشنی میں نفسیاتی مسائل کواپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی افسانوی مجموعہ ”انگارے“ ہے جو 1932ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے ائع ہوتے ہی ادبی حلقوں میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ ہرطرف سے اس پر لعطن طعن ہونے لگی اور حکومت نے اس پر پابندی عائد کرتے ہوئے اس کی تمام کاپیاں ضبط کرلیں۔ اس طرح سے یہ افسانوی مجموعہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ لیکن اس نے دیگر افسانہ نگاروں کے ذہن کے بند دریچوں کو کھول دیاتھا۔ جس کے نتیجے میں نئے افکار و نظریات کے تحت افسانہ نگاروں نے جدید موضوعات اورفن کی نئی راہوں کو اپنانا شروع کردیا۔

اردو افسانے میں دو طرح کی روایتیں پروان چڑھیں اوردو الگ الگ راہیں بنیں۔ ایک پریم چند کی اوردوسری ”انگارے“ کی۔ پریم چند نے نئے افسانہ نگاروں کو بتلایاکہ بندھی بندھائی زندگی کے لئے کس طرح نئی راہیں تلاش کرنی چاہئیں۔ جبکہ ”انگارے“ کی روایت نے یہ سبق سکھلایا کہ ادب خصوصاً کہانی کی فرسودہ روایات اور طریق کار کو چھوڑکر کس طرح نئے راستے بنانے چاہئیں۔

”کفن“(پریم چند کی مشہور تصنیف) اورانگارے کی اشاعت کے کچھ سال بعد یعنی 1936ء میں مارکس کے خیالات اور اشتراکی نظریات کی بنیادوں پر ترقی پسند تحریک کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے ادب کے دوسرے شعبوں کے ساتھ اردو افسانے کو بھی نئے جہات سے آشناکیا۔ ایک طرف منشی پریم چند نے ترقی پسند تحریک کا لائحہ عمل تیار کیا تو دوسرے جانب ’انگارے‘ کے مصنفین نے اپنی کامیابی سے سرشار ہوکر نئی ادبی تحریک کو آگے بڑھانے اور اسے مؤثر بنانے کی کڑی جدوجہد شروع کردی۔

1947ء تک اردو ارفسانہ کم وبیش انہی راہوں پر آگے بڑھتارہا۔اس پورے دور کے افسانہ نگاروں نے پریم چند کے ذریعہ ”انجمن ترقی پسند مصنفین“ کی پہلی کانفرنس کے موقع پر دیئے گئے خطبۂ صدارت پر نظر رکھتے ہوئے ’انجمن ترقی پسند تحریک‘ کے منشور پر عمل پیرا رہے۔ ساتھ ہی ساتھ مغرب کے افسانوں کی تکنیک بھی ان کے پیش نظررہی۔ یہی سبب ہے کہ اس دور کے افسانوی موضوعات میں کافی وسعت پیدا ہوئی اور فن میں بھی نکھار آگیا۔ موضوع کے لحاظ سے یہات کی زندگی،دیہاتی معشیت، سیاست، حب الوطنی اور جذبۂ آزادی کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار و مزدور، طبقاتی نظام، دولت کی غیر مساوی تقسیم اور اس قسم کے دیگر مسائل اردو افسانوں کے موضوع بنے۔ اتناہی نہیں بلکہ مغربی ادب سے استفادے نے نفسیاتی اور جنسیاتی موضوعات کے دروازے بھی کھول دیئے اور مغربی افسانے کی تکنیک کے زیر اثر اردو افسانے بھی نئے تکنیکی سانچے میں ڈھلنے لگے اور ایسے میں جب 1947ء میں تقسیم ہند کا سانحۂ عظیم پیش آیا اور پورا برصغیرفسادات کی آگ میں جلنے لگا نیز ملک کے تمام حصوں میں بالعموم بنگال وپنجاب کے علاقوں میں بالخصوص خون کی ندیاں بہہ اٹھیں، پھر خوف و نفرت کی یہ کیفیت جب ایک سال بعد ذرا کم ہوئی، ذہن کچھ پُرسکون ہوئے اورظالم ومظلوم کے چہرے نمایاں ہونے شروع ہوئے نیز ہمارے دانشور طبقہ کو بھی اپنے اور دوسروں کے دکھوں کے درمیان ایک قدرمشترک نظر آئی توفن کاروں اور ادیبوں کے سوتے پھرسے پوٹے، جن پر غالب اثر فسادات کی اندوہناکی کا تھا۔ لہٰذا فنکاروں اور ادیبوں نے ایک عرصہ تک اس المیے کو اپنے فن کا موضوع بنایا۔ یوں تو فسادات آزادی سے پہلے بھی ہوتے تھے اور اب بھی ہورہے ہیں لیکن آزادی کے فوراً بعد اس کارنگ اور اثر بالکل الگ تھا۔ مشہور افسانہ نگار اور ناقد رام لعل فرماتے ہیں:

”آزادی کے بعد ہمارا پہلا فکری تجربہ فسادات تھا۔ جس کے اظہار سے اردو ہی کیا کسی زبان کا لکھنے والا ادیب خود کو الگ نہیں رکھ سکا اور یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔ اگرچہ نفرت، اخوت اور دکھ کا یہ احساس دھیرے دھیرے کم ہوتا گیا، ٹوٹے اعتمادپھر سے جڑتے رہے لیکن اتنی بڑی Massuprooting نے جو کئی طرح کے مسائل پیدا کردیئے تھے اس کے ذکرکوخاص عرصے تک محدود نہ رکھا جاسکا۔13ے“

اور ممتاز شیریں نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

”ہمیں اپنے اردگرد کی زندگی میں ہر طرف فسادات کے بھیانک اثرات نظر آتے ہیں۔ فسادات نے زندگی کو تہہ و بالاکر کردیا تھا۔ اس لئے فسادات نے ہمارے ادب پر اثر ہی نہیں ڈالا بلکہ ادب پر اس طرح چھاگئے کہ عرصہ تک اورکسی موضوع پر شائد ہی کچھ لکھا گیا ہو۴۔۱ے“

ملک میں ایسے فنکار اورافسانہ نگارتھے جنھوں نے فسادات کی جسم وجان کو جھلسادینے والی گرمی کا عملی طور پر توسامنا نہیں کیا مگر ذہنی طورپر انھوں نے فسادات کے اثر کو محسوس کیا تھا۔ چنانچہ ایسے فنکاروں اور افسانہ نگاروں کے علاوہ جو اپنی زندگی کے سب سے المناک تجربے سے گزرکر اسے اپنی

تخلیقات کا موضوع بنا رہے تھے۔ ایسے لوگ بھی تھے جو بمبئی یا لکھنؤ کی بہ نسبت زیادہ پرسکون فضاؤں میں رہ کر بھی مذکورہ قبیل کے موضوعات کو اپنی فکر اور اپنے Involvement کے ہلکے پھلکے فرق کے ساتھ ناول یا افسانے کو شکل دے رہے تھے۔ مگر انہی میں کچھ ایسے بھی تھے جنھیں اس پر سخت اعتراض تھااوران میں محمد حسن عسکری پیش پیش تھے۔ فرماتے ہیں:

”اور جب1947ء کے فسادات ہوئے تو گویا اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کر دیا۔ جی چاہے تو المیہ افسانے لکھئے ورنہ طنزیہ مضمون۔ انسانوں کی درندگی پر دانت پیسئے، سامراج کی چالاکیوں کا پردہ چاک کیجئے۔ ان باتوں سے جی بھرجائے تو کچھ عورتوں کی بے حرمتی سے گرمی پیدا کیجئےموقع موقع سے یہ بھی دکھاتے چلئے کہ اس بہیمیت کے ساتھ ساتھ رحم دلی اور انسانی ہمدردی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ پھر بھولا سا منہ بناکر تعجب کیجئے کہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی عقل کو کیا ہوگیا۔ 15؎“

عسکری صاحب کا یہ اعتراض محض اس لئے تھے کہ ان کے خیال میں فساد جیسا موضوع افسانہ نگاری یا تخلیقی ادب کے لئے موزوں نہ تھا اس لیے کہ وہ اس نظرئیے کے حامی تھے کہ ادب محض ادب ہے اُسے ظالم و مظلوم سے کیا غرض۔ وہ خود لکھتے ہیں:

”اپنے شریفانہ جذبات کو منظر عام پر لاناس طرح دوسروں کے شریفانہ جذبات کو مشتعل کرنا بھی توانسانیت کی خدمت ہے البتہ شریفانہ جذبات میں تھوڑی سی کسریہ ہے کہ ان کے ذریعہ ادب کی تخلیق نہیں ہوسکتی۔16؎“

اس سے قطع نظر اردو کے انگنت افسانہ نگاروں نے فسادات کے المیے کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا اور ایسے پُراثر افسانے تحریر کئے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ اُردو افسانہ نگاروں نے تب اپنے لئے جو میزان مقرر کیا تھا وہ بقول اخترحسین رائے پوری کچھ اس قسم کا تھا:

”تاریخ کے اس کٹھن دور میں ہمیں اپنا توازن برقرار رکھنا ہے۔ ہمیں ادب اور انسانیت دونوں میں انصاف برتنا ہے۔ فسادات ہوئے ہیں اوران کے ذمہ دار انسان ہیں جو سکھ ہندویا مسلمان کے بہروپ میں نظر آتے ہیں۔ یہ اپنے مذہب کے لئے باعث ننگ ہیں تاہم ہم اس کے مجاز نہیں کہ پوری قوم کو مورالزام ٹھہرا کر سولی پر ٹانگ دیں۔17؎“

فسادات کے زیر اثر تحریر کیے ہوئے افسانوں میں ہمیں سب سے پہلے کرشن چندر کے متعدد افسانے ملتے ہیں جوان کے مجموعے ”ہم حشی ہیں“ میں شامل ہیں۔اس کے علاوہ حیات اللہ انصاری کا ”شکرگزار آنکھیں“ اور ”ماں بیٹا“ خواجہ احمد عباس کا ”سردارجی“ ممتاز مفتی کا ”گھوراندھیارا“احمد ندیم قاسمی کا ”نیافرہاد“ اور ”فساد“ سعادت حسن منٹو کا ”موذیل“ ممتاز حسین کا ”سورج سنگھ“ صالحہ عابد حسین کا ”نراس میں آس“ عادل رشید کا ”درندہ“ یکتا امروہوی کا ”خونی ہے ہندوستان“ گریش چندر کا افسانہ ”مذہب کے نام پر“ اور بعد کے دنوں میں ”کفّارہ“ (وشنو پربھاکر)”بلاعنوان“ (رضی الدین صدیقی) کا ”جولوٹ کر گھر واپس نہیں آئے“ (مہدی ٹونکی) اور دوسری ہجرت (ذکیہ مشہدی) اہم اور قابل ذکر ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوی مجموعہ ”ہم وحشی ہیں“ میں شامل انسانوں میں مؤثر طور پر ”فسادات“ کی ہولناکیوں کی غمازی کرنے والا افسانہ ”پشاورایکسپریس“ ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے فسادات کی ہولناکی کو ٹرین کی زبانی بیان کرایا ہے۔ یہ ٹرین جیساکہ نام سے ہی ظاہر ہے پشاور سے چلتی ہے اور لاہور ہوتی ہوئی بمبئی تک جاتی ہے۔ جہاں جہاں سے یہ پشاور اکسپریس گزرتی ہے وہاں وہاں ہندو مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کا خون بہاتے نظرآتے ہیں۔ ہرطرف لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ عورتوں کی بے عزتی اور بے حرمتی ہو رہی ہے اورتو اور خود اس ٹرین کے اندر بیٹھے مسافروں میں بھی مذہبی تعصب ابال کھا رہا ہے اور یہ تعصب اس قدر زور پکڑے ہوئے ہے کہ دونوں ہی فرقے کے افراد ایک دوسرے کا خون بہاکر برابر برابر اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے گھر کو لٹاہوا دیکھ کر انہیں تب تک چین نہیں ملتا جب تک کہ مخالف فرقے کا بھی گھرنہ لوٹ لیں۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے فسادزدہ ماحول کا تذکرہ کرتے ہوئے ”پشاور اکسپریس“ کے لاہور اسٹیشن پر رکنے کے بعد کا نقشہ کچھ یوں بیان کیا ہے:

”مجھے پلیٹ فارم نمبر ’۱‘ پر کھڑا کیا گیا۔نمبر ’۲‘ پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ جوابھی امرتسر سے آئی تھی اوراس میں مسلمان پناہ گزیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد مسلم خدمتگارمیرے ڈبے کی تلاشی لینے لگے۔ زیور، نقدی اوردوسرا قیمتی سامان مہاجرین سے لے لیاگیا۔ اس کے بعد چارسو آدمی ڈبوں سے نکال کر پلیٹ فارم پر کھڑے کئے گئے۔ یہ مذبح کے بکرے تھے۔ کیوں کہ ابھی ابھی نمبر ۲ پلیٹ فارم پر جو گاڑی مسلمان مہاجرین کی آکر لگی تھی اس میں چارسو مسلمان مسافر تھے۔ پچاس عورتیں اغوا کرلی گئی تھیں۔ اس لیے یہاں بھی پچاس عورتیں چن چن کر نکالی گئیں اور چارسو ہندو مسافروں کو تہہ تیغ کیا گیا تاکہ ہندوستان اور پاکستان میں آبادی کا توازن برقرار رہے۔18؎“

اور جب ”پشاور اکسپریس“ ہندوستانی سرحد میں واقع ’اٹاری‘ اسٹیشن پر پہنچتی ہے تو اس میں موجود مسافروں کا یہ حال ہے:

”اٹاری پہنچ کر تو مسلمانوں کی اتنی لاشیں ہندومہاجرین نے دکھیں کہ فرط مسرت سے ان کے دل باغ باغ ہوگئے۔ آزاد ہندوستان کی سرحد آگئی تھی ورنہ اتنا حسین منظر کس طرح دیکھنے کو ملتا۔19ـــ؎“

کرشن چندر کے اس افسانہ یعنی ”پشاور اکسپریس“ پر ایک پاکستانی مبصر ڈاکٹر مہناز انور نے کچھ اس قسم کا تبصرہ کیا ہے:

”اس افسانے میں افسانہ نگار نے آزادی کی خوشیوں کے تصور سے دور ہٹ کر تقسیم ہند کی بناپر ہورہے فسادات کا بڑاہی دلدوز نقشہ کھینچا ہے جس کا ذمہ صرف اور صرف انسان کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اس انسان کو جو مذہب کے غلط تعصباتی رویے کی بناء پر اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے خون کے پیاساہوگیاتھا۔20ـــ؎“

اورمحترمہ ممتاز شیریں کا خیال کچھ اس قسم کا ہے:

”ترازو بہت احتیاط سے پکڑی گئی ہے لیکن اس کے باوجود ایک پلڑا ذرا جھک گیا ہے اور غلط پڑا ہے........ کیوں کہ پاکستان کی سرحدپارکرنے کے بعد اس میں مظالم کی تفصیلیں پھیکی پڑگئی ہیں۔21ـــ؎“

اسی مجموعہ (ہم وحشی ہیں) میں شامل کرشن چندر کا دوسرا اہم افسانہ ”ایک طوائف کا خط“ہے جو دراصل فسادات کے دوران اپنے والدین اور کنبے کو کھوچکی دو لڑکیوں ’بیلا‘اور ’بتول‘کی داستان ہے۔ جسے افسانہ نگار نے خط کی تکنیک کے ذریعہ ایک طوائف کی زبانی بیان کرایا ہے۔

کچھ اسی قسم کی ملتی جلتی داستان بتول کی بھی ہے۔ وہ جالندھر کی رہنے والی ہے۔ جاٹ فسادی ایک دن اس کی نظروں کے سامنے اس کے والدین کو قتل کر دیتے ہیں اوراس کے بعد اس کے بھائیوں کو بھی ماردیتے ہیں اتنا ہی نہیں ان کے مردہ منہ میں باری باری پیشاب کرتے ہیں اوراس کی بہنوں کی یکے بعد دیگرے عصمت دری کرتے ہیں۔ اور انہیں بھی موت کی نیند سلادیتے ہیں۔ بتول کسی طرح اپنی جان بچاکر بھاگتی ہے مگر بدقسمتی سے ایک ہندو دلال کے ہاتھوں چڑھ جاتی ہے اور اسی طوائف کے یہاں بیچ دی جاتی ہے، جہاں پہلے سے بیلا موجود ہے۔........ اس طرح طوائف کی زبانی بیلا اور بتول کی داستان سنانے کے بعد افسانہ نگار نے اسی طوائف کی زبانی دونوں ممالک کی اعلیٰ ترین شخصیات یعنی پنڈت جواہر لال نہرہ اور محمدعلی جناح سے کچھ اس قسم کے سوالات کئے ہیں۔ ملاحظہ ہواس افسانے کا یہ اقتباس:

پنڈت جی میں چاہتی ہوں کہ آپ بتول کو اپنی بیٹی بنالیں اور جناح صاحب میری خواہش ہے کہ آپ بیلا کو اپنی دختر نیک اختر سمجھیں۔ ذراایک بار انھیں فارس روڈ کے چنگل سے چھڑاکر اپنے گھر میں رکھئے اوران لاکھوں روحوں کا نوحہ سنئے۔ یہ نوحہ”نوا کھالی سے راولپنڈی تک اور بھرت پور سے بمبئی تک گونج رہا ہے۔ لیکن اس کی آواز کیا صرف پارلیامنٹ ہاؤس میں سنائی نہیں د یتی؟ کیا یہ آواز سنیں کے آپ۲۲ـــ؎“

لیکن جس طوائف کے یہاں بیلا اور بتول دونوں لڑکیاں رہ رہی ہیں اس کے خیالات ان لڑکیوں کے بارے میں کچھ اس قسم کے ہیں۔ ملاحظہ اسی افسانہ سے یہ حصہ:

”بیلا اور بتول دو لڑکیاں ہیں۔ دو مندر اور مسجد ہیں بیلا اور بتول آج کل فارس روڈ پر مجھ جیسی رنڈی کے یہاں رہتی ہیں جو چینی حجام کے بغل میں اپنی دوکان اور دھندہ چلاتی ہے۔ بیلا اور بتول کو یہ دھندہ پسند نہیں۔ میں نے انھیں خریدا ہے۔ میں چاہوں تو ان سے یہ کام لے سکتی ہوں مگر میں یہ سوچتی ہوں کہ میں وہ کام ہرگز نہیں کروں گی جو راولپنڈی اور جالندھر نے ان کے ساتھ کیا ہے۔23ـــ؎“

حیات اللہ انصاری نے فسادات کو موضوع بناکر جو افسانے لکھے ہیں۔ ان میں ”شکرگزار آنکھیں“اور ’ماں بیٹا‘اہم اور قابل ذکر ہیں۔ افسانہ ’شکرگزار آنکھیں‘ افسانہ نگار کی بے پناہ قوت مشاہدہ، قدرت اور فنی چابکدستی کا غمازہ ہے۔ ایک شخص کا اپنی سفاکانہ عمل کے باعث خود کو تڑپا کے سزا دینے کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ میں تقسیم ہند کے بعد فسادات کا منظر اپنے تمام تر جزئیات کے ساتھ موجود ہے:

”ایک دولہن اپنے گھر سے جہاں قتل و غارت گری جاری ہے اوراس کے ماں باپ بھی قتل ہوچکے ہیں۔ اپنے زخمی شوہر کو کاندھے پر لادے بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ ایک جگہ وہ آرام کی خاطر اپنے شوہر کا سرزانوؤں پر لئے بیٹھی ہے کہ فسادی آجاتے ہیں۔ وہ جانتی ہے کہ اب اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ آخرکار وہ ہمت کرکے فسادیوں کے سامنے آجاتی ہے اور کہتی ہے:

”مہاشے میری صرف ایک پرارتھنا ہے۔ مجھے ابھی ان کے سامنے مار دیجئے۔ ایک فسادی اس کی بات مان لیتا ہے اور تلوار کا ایک بھرپور واراس کی گردن پرکرتا ہے۔ دولہن گرتی ہے۔ ”شکرگزار آنکھیں“ قاتل کی طرف اٹھتی ہیں اورپھر شوہر پر حسرت و محبت بھری نگاہیں جمائے اس کی روح فنا ہوجاتی ہے۔اس احساس سے مطمئن کہ اس نے اپنے شوہر کی موجودگی میں پاکیزگی کی حالت میں جان دی ہے۔24ـــ؎“

پروفیسر وقار عظیم نے حیات اللہ انصاری کے اس افسانے کو بڑا سراہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”افسانہ شکرگزار آنکھیں“حسن بیان، شدت احساس، بلندیٔ تخیل اور تحلیل فکر کا ایک لطیف اور پرتاثیر امتزاج ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے کسی خاص واقعے کا نہیں بلکہ اس کے شدید تاثر کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ یہی وہ شدید تاثر ہے جو تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ حالات کے سبب فسادات سے ابھرنے والے ایک کردار کی کیفیت اور بہیمانہ جذبے کے خلاف ایک شدید احتجاج اور پچھتاوے کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔25ـــ؎“

اور ممتاز شیریں کے خیالات اس افسانے سے متعلق کچھ اس قسم کے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

حیات اللہ انصاری کا افسانہ ”شکر گزار آنکھیں“ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ نیا خیال اور نیا انداز ہے۔ اس میں ایک آدمی کے دو Selves پیش ہوئے ہیں۔ ایک Self متعصب ہے اور دوسرا انسان۔ مرتی ہوئی دولہن کی شکرگزار آنکھیں اس کے رگ وپے میں سماجاتی ہیں اورہر وقت اس کا تعقب کرتی رہتی ہیں اور وہ اپنے پہلے Self کو قتل کر ڈالتا ہے۔ اس میں گناہ سے آلودہ ضمیر رِستے زخموں اور جانکاہ اندرونی کیفیتوں کی بڑی بھیانک تصویر ہے۔ فرد کی اندرونی اذیتی کیفیتوں کو ایک الگ ہی چیز سمجھا گیا ہے۔ یہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ کس طرح اندرونی کیفیت بھی خارجی ماحول کی پیدا وار ہے۔26ـــ“

افسانہ ”ماں بیٹا“ فسادات کے زیر اثر تحریر کیا جانے والا حیات اللہ انصاری کا دوسرا اہم افسانہ ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے سرحدپر مسلمانوں کے ذریعہ ہندوؤں پر کئے گئے مظالم کا بڑے ہی درد بھرے انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ ’رامو‘ اس افسانے کا ایک ہندوکردار ہے جوکہ ایک دودھ پیتا ہوا بچہ ہے اور مسلمانوں کے ہاتھوں شدید طورپر زخمی بھی۔ اس کے والدین اورکنبہ والوں کو مسلمان فسادیوں نے مار ڈالا ہے۔ ’مومنہ‘ ہندوؤں کے ذریعہ ستائی ہوئی ایک مسلمان عورت ہے۔ جب وہ رامو کی دردبھری آواز سنتی ہے تواس کی ممتا جاگ اٹھتی ہے وہ اسے اپنی پناہ میں لے لیتی ہے اس کو اپنے بچے کی طرح رکھتی ہے۔ اس کی خدمت کرتی ہے۔ اسے پانی پلاتی ہے۔ اس کے زخم دھوتی ہے یہاں تک کہ جب اسے بھوک لگتی ہے تواسے اپنا دودھ بھی پلاتی ہے۔ غرض پورا افسانہ درد اور اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن اس میں افسانہ نگار حیات اللہ انصاری ”شکرگزار آنکھیں“ جیسی بات پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ بقول سید وقارعظیم:

”میاں بیٹا“ حیات اللہ انصاری نے ایک بڑے پس منظر میں یہ بتایا ہے کہ زندگی اس قدر تلخ اور ناخوشگوار ہونے کے باوجود بھی کم بخت کتنی عزیز ہے۔ اس بات کے اظہار کے لئے افسانہ نگار نے خاصا فنی اہتمام کیا ہے اورجذبات کے اظہار کے لئے موزوں سے موزوں اظہار بیان وضع کیا ہے۔ اورپورے سوچ وچار کے بعد ایک ایساافسانہ لکھا ہے جس میں فن کاپورا ٹھہراؤ بھی ہے اوراس کا شمار اس دور کے اچھے افسانوں میں ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس اچھائی میں کہیں کہیں ایک آنچ کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کمی ”شکر گزار آنکھیں“ میں البتہ نہیں ہے۴۲ـــ“

افسانہ ”سردارجی“ خواجہ احمد عباس کا تحریر کردہ ہے۔ جس میں افسانہ نگارنے سکھوں کی زندگی، ان کے رہن سہن، بول چال کے طریقے اوران کی مختلف طبیعتوں کا ذکر اور اس کی عکاسی کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ فسادات اوراس کے دوران انسانیت کا احترام کرنے والے افراد کی خدمات کا بھی اعتراف کیا ہے۔یہ فساد دراصل ایک بیانیہ ہے جس کا راوی ایک مسلمان کردار ہے جو شروع ہی سے سکھوں کے خلاف نفرت کا جذبہ لئے ہوئے ہے۔ وہ ہرقوم پر بھروسہ کرسکتا ہے مگر سکھ قوم اس کے لئے ناقابل اعتبار ہے۔پانچ سال کی عمر سے یونیورسٹی کی تعلیم تک اس نے ہمیشہ بس سکھوں کا مذاق ہی اڑایا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت اتفاق سے دہلی میں اس مسلمان کردار کا پڑوسی بھی ایک سکھ ہے جو خود راولپنڈی سے مسلمان فسادیوں کے ہاتھوں سے کسی طرح بچ کر آیا ہوا ہے۔ یہ سکھ پڑوسی اس مسلمان سے ملنا چاہتا ہے اور دوستی کا خواہشمند بھی ہے لیکن یہ مسلمان کردار ہمیشہ ہی اس سے دامن بچاکر نکل بھاگتا ہے۔ پھر اچانک:

”ایک دن یہ خبر آئی کہ دہلی میں قتل عام شروع ہوگیا ہے۔ ’قرول باغ‘ میں مسلمانوں کے سیکڑوں گھر پھونک دیئے گئے ہیں۔ چاندنی چوک میں دوکانیں لوٹ لی گئی ہیں اور ہزاروں کا صفایا ہوگیا ہے۔28ـــ“

ایسی حالت میں اسے اس کے سکھ پڑوسی نے یقین دلایا کہ اسے کسی بھی طرح فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہرطرح سے اس کی حفاظت کا ذمے دار ہے۔ لیکن ایک ایسا شخص جس نے ہمیشہ سے ہی سکھوں کے بارے میں ایک غلط تصور قائم کیا ہووہ اس پر کیوں کر بھروسہ کرسکتاتھا۔ اچانک ایک روز فسادی اس کے گھر پر حملہ کردیتے ہیں اس سے قبل کے وہ مسلمان فسادیوں کے ہاتھوں چڑھے اس کا وہ سکھ پڑوسی اسے اپنے گھر چھپالیتا ہے۔ لیکن جب فسادی اس کے یہاں بھی اس مسلمان کی تلاشی میں آجاتے ہیں تووہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرتاہے اوراپنے مسلمان پڑوسی کی جان بچاتے ہوئے خود موت کی نیند سوجاتاہے۔ ایسے میں وہ مسلمان زندگی بھر کی سکھوں کے اپنی نفرتوں کو بھول کر اس سکھ کو ہی اپنا ناخدا سمجھنے لگتاہے اوربالآخر اس کے مرنے سے قبل اس سے پوچھ ہی لیتا ہے:

”سردار جی یہ تم نے کیا کیا؟“سردارجی یہ تم نے کیا کیا؟“ سردار جی یہ تم نے کیا ؟“

”مجھے قرضہ اتارنا تھا بیٹا“

قرضہ؟

ہاں! راولپنڈی میں مجھے ایک بار تمہارے ہی جیسے ایک مسلمان نے اپنی جان دے کر میری اور میرے گھروالوں کی اجّت (عزت) بچائی تھی۔29ـــ“

اس طرح اس مسلمان کردار کے ذہن میں سکھوں کے خلاف جو نفرت کار فرما تھی وہ ایک دم ہمدردی اور شکریے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر حامد چھپروی کہتے ہیں:

”خواجہ احمد عباس نے افسانہ ’سردارجی‘ میں انسانیت کی اس روشنی کو دکھلایا ہے جو تعصب اور نفرت کے اس طوفان میں کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔“

افسانہ نگار عزیز احمد نے افسانہ ’کالی رات‘ میں فسادات کے دوران اس کی ہولناکیوں سے متاثرہ ایک شادی شدہ جوڑے کے المیے کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے کا ہیرو فسادیوں سے اپنی بیوی کی آبرو بچانے کے لیے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی بیوی کو گولی مار دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو اس افسانہ کا یہ اقتباس:

”ریل کے مقفل ڈبے میں ایک نیا شادی شدہ جوڑا ہے۔ گاڑی روک لی گئی ہے۔ باہر درندے دروازہ توڑنے کی کوشش کررہے ہیں۔ دولہا اپنا ریوالور دیکھتا ہے اس میں صرف دوگولیاں باقی رہ گئی ہیں۔ دولہن اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ جاتی ہے۔ ’بتول‘ وہ تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔دولہن قریب آجاتی ہے۔نہیں میں موت سے نہیں ڈرتی ہوں۔ دولہا دولہن کو بانہوں میں سمیٹ کر سینے سے لگالیتا ہے۔ ہونٹ آخری بار ملتے...... پھر ’بتول‘ تمھیں امام ضامن کے سپرد کیا۔30؎“

اور ریوالور کنپٹی سے لگاکر فائر کردیتاہے۔“

ایک پاکستانی ناقد ڈاکٹر انوار احمد نے عزیز احمد کے اس افسانے ’کالی رات‘ پر کچھ ان الفاظ میں تبصرہ کیاہے:

”کالی رات برصغیر کے آسمانوں، کتابوں اور انسانوں نیز ان کے دلوں پر چھا جانے والی فسادات کی رات ہے۔ ان فسادات کی چند ہولناک اوردردناک مناظر اس افسانے میں سمٹ آئے ہیں۔31؎“

سہیل عظیم آبادی کا افسانہ ’اندھیارے میں ایک کرن‘پوری طرح ایک ہندو خاندان کے اردگرد گھومتاہے۔ یہ ہندو خاندان فسادات کے دوران نہ صرف مسلمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے بلکہ ان کی حفاظت کرتے ہوئے اس خاندان کاایک فرد ’چندر‘ اپنی جان بھی دیتا ہے۔ دراصل اس افسانے میں افسانہ نگار نے صدیوں سے چلے آرہے ان تعلقات کو پیش کیا ہے جو ہندوستانی تہذیب کا ایک اہم ستون تصور کئے جاتے ہیں۔ اوراس کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایسے پُرآشوب دور اور تعصب بھرے ماحول میں بھی انسانیت زندہ ہے۔ اورآج بھی انسانیت کی حفاظت کی خاطر اپنی جان نچھاور کردینے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

”افسانہ سورج سنگھ“ میں افسانہ نگار ممتاز حسین نے ایک ہندو اورمسلمان خاندان کی آپسی محبت اور گہرے تعلقات کو پیش کیا ہے۔تقسیم ملک کے بعد جو فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہوتاہے توفسادیوں کے ہاتھوں اس مسلمان خاندان کے سارے افراد موت کے گھات اتار دیئے جاتے ہیں۔......... لیکن جب سورج سنگھ کو یہ معلوم ہوتاہے کہ اس مسلمان خاندان کو جن فسادیوں نے موت کی نیند سلایا ہے ان میں خود ان کا اپنا بیٹابھی شریک تھا تووہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو گولی ماردیتا ہے۔..... اس طرح وہ اپنے بیٹے کو ختم کرکے محبت، شرافت اوراس اصول کی جڑوں کو سینچتا ہے کہ قاتل بہرحال قاتل ہے اوراس کو معاف کردینا تمام عالم انسانیت پر ظلم ہوگا۔

افسانہ ”بن لکھی رزمیہ“ تقسیم ہند کے بعد لکھا گیا۔ انتظار حسین کاایک اہم افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے سیاسی اور معاشی پس منظر میں پوری قوم کے اس تجربے کو پیش کیا ہے جو تقسیم وطن اور اس کے بعد ہوئے فسادات کے دوران وحشت اور بربریت، افراتفری، مسلمانوں کا پاکستان کو جائے پناہ سمجھنا اور پھر ہندوستانی مسلمانوں کی شکست خودگی اور مایوسیاں ان تمام چیزوں کو بخوبی پیش کیا ہے کہ وہ پورا دور قاری کے سامنے جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ دراصل افسانہ ’بن لکھی رزمیہ‘ میں پہلی بار تقسیم ہند اور فسادات سے انسانی سماج و معاشرہ اور زندگی میں پڑنے والے انگنت شگافوں کا دکھایا گیا ہے۔ اوراس میں شک نہیں کہ افسانہ ’بن لکھی رزمیہ‘ انتظار حسین کی عظیم ترین تخلیق ہے۔ ممتاز شیریں کے بقول:

”انتظار حسین کی ’بن لکھی رزمیہ‘ تقسیم ہند کے بعد لکھی گئی ساری چیزوں میں ایک خاص وقیع حیثیت رکھتی ہے جس میں انسانی شخصیت کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔33؎“

اور ڈاکٹر حامد چھپروی کا خیال کچھ اس قسم کا ہے:

”فسادات پر جتنے افسانے لکھے گئے وہ عام طورپر ہنگامی حالات اور شخصی تجربوں کی پیداوار تھے۔ لیکن فسادات، قتل عام اور خونریزی سے بڑھ کر پوری قوم کو ایک ایسے المیے سے گزرناپڑا جس کے نتائج اوراثرات سماج اور معاشرے کی جڑوں تک پہنچتے ہیں اورجن سے تہذیب و معاشرہ اور سماج گہرے طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ فسادات اور تقسیم ملک کو بہت کم افسانہ نگاروں نے اس وسیع پس منظر میں دیکھا ہے یا اس کی کوشش کی ہے۔ انتظار حسین کی ’بن لکھی رزمیہ‘ اس سلسلے کی کامیاب کوشش ہے۔“

افسانہ ”گھور اندھیارا“ تقسیم ہند کے سبب ہورہے فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں تحریر کئے جانے والے افسانوں میں ایک اہم اور قابل ذکر افسانہ ہے۔ افسانہ نگار ممتاز مفتی نے اس افسانے کاآغاز یوں تو خوبصورتی سے کیا ہے مگر پھر اس میں جذباتیت اور کلبیت غلبہ پالیتے ہیں اورافسانہ نگار انجا م تک پہنچ کر ترقی پسندوں کی طرح مثالیت سے کام لینے لگتاہے۔ ملاحظہ ہو مندرجہ ذیل اقتباس:

”نہیں نہیں، کوچوان نے لپکتاہوا سایہ دیکھ کر چلّانا شروع کردیا، نہیں نہیں میں مسلمان نہیں ہوں، میں تو کوچوان ہوں، کوچوان۔35؎“

”وہ ہنسی،چہرہ پر خندہ ہنسی، سب جھوٹ، کوئی مسلمان، کوئی ہندو، کوئی سکھ نہیں۔ یہاں درندے بستے ہیں درندے۔36؎“

”گاڑی سے ایک عورت نے سرنکالا، اس کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں اورکمر سے ایک بچہ لٹک رہا تھا۔ اس نے چھاتیوں کی طرف اشارہ کرکے کہا ”امرتسر۔37؎“

اس نے کہا آؤ تمھیں کیمپ پہنچادوں۔ اور میں پاکستان پہنچتے پہنچتے لٹ گئی۔38؎“

افسانہ ”نیا فرہاد“ احمد ندیم قاسمی کے تحریر کردہ اس افسانے کا انجام یوں تو بے حد مصنوعی ہے لیکن ابتدا میں فسادات کی ہولناکیاں اورتکلیف دہ محرکات کی نشاندہی عمدہ طریقے سے کی گئی ہے۔ فسادات کس طرح شروع ہوتے ہیں اوران میں افواہوں کا کیا عمل دخل ہوتا ہے اس کے مضمرات کو افسانہ نگار نے بخوبی اس افسانے میں سمودیا ہے۔ اس افسانے میں فسادات کے دوران افواہوں کی تباہکاریوں کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

”لاہور کی ٹھنڈی سڑکوں پر مسلمانوں کی لاشیں بچھادی گئی ہیں اوران پر سکھوں اور ہندوؤں کی موٹریں اور لاریاں گزررہی ہیں۔ اوران پر کودا ناچا جارہا ہے اور ’لارینس باغ‘ میں ایک بہت بڑی دیگ رکھ دی گئی ہے، جس میں تیل کڑکڑا رہا ہے اوراس میں شرخوار مسلمان بچے تلے جارہے ہیں۔ اور لاہور کی بڑی مسجد ہے نا اس کے چاروں مناروں پرہنامان کی مورتیاں لگادی گئی ہیں۔39؎ “

بس اسی افواہ سے ایک پرامن گاؤں میں فساد کی آگ بھرک اٹھتی ہے۔ ندیم قاسمی نے اس افسانے کے ذریعہ ان لوگوں کے مکروہ چہروں سے پردہ ہٹانے کی کوشش کی ہے جو فساد بھڑکاکر اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں۔

افسانہ ”فساد“ جیساکہ نام سے ظاہر ہے افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی نے اسے تقسیم ملک کے سبب ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں تحریر کیا ہےجس میں فسادات کے دوران مارے جانے والے بیٹے کا اندھاباپ اور فساد زدہ ہیبت ناک رات کی بڑی دلدوز رُوداد بیان کی گئی ہے۔ تاثر کے اعتبارسے یہ یقینا احمد ندیم قاسمی کی سب سے گہری کہانی ہے اوریہ بھی عجیب بات ہے کہ پولیس کے ایک سپاہی کو پہلی بار محض ایک ہمدرد ناظر کے روپ میں نہیں دکھلایا گیا ہے بلکہ اردو ادب کی افسانوی تاریخ میں شاید پہلی اور آخری بار ہندوستانی پولیس کے سپاہی کو ایسے صاحب دل کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جس پر اعتراض کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اوریہی اس افسانے کی افسانوی فضا کا اعجاز ہے۔ اس افسانے کے دوحصے ملاحظہ ہوں:

”بچے تو تھے ہی اس توتو میں میں کے بعد ہاتھاپائی پر اترآئے۔ ادھر سے چند غنڈے گزر رہے تھے، انھوں نے دونوں کو الگ کرکے نام پوچھا۔ ایک نے کہا میرانام لعل دین ہے۔ دوسرے نے کہا میرا نام لال چندہے۔ پاس ہی ایک دوکاندار یہ باتیں سن رہا تھا۔ بولا ہائیں ہندو مسلمان۔ دوسرے دوکاندار نے کہاا ے کیا ہوا یہ مجمع کیا ہے؟ ادھر سے جواب ملا ایک ہندو اور مسلمان میں جھگڑا ہوگیا ہے۔ تیسرا دوکاندار پکار اٹھا ’ہندومسلمان میں جھگڑا‘۔ چوتھی دوکان سے آواز آئی؟ کیا ہندو مسلم فساد؟ پھر کیا تھا ہندو مسلم فساد، ہندو مسلم فساد کا شور مچ گیا۔ دوکانیں گھٹا کھٹ بند ہونے لگیں۔ دریچوں سے تیزاب کی پچکاریاں چھوٹنے لگیں، چاقو چلنے لگے۔40؎“

”سپاہی بولا ہندوستان کے فساد کی شہرت اسی وجہ سے تو قائم ہے۔ عید پر فساد، محرم پر فساد، دسہرے پر فساد۔ انسانی لہوبہاں کے تہواروں کے خاص جزو ہیں۔ لہونہ بہے تو یہاں کے تہوار چپ چاپ گزرجائیں اور فسادی یہ بے رونقی کب گوارہ کرتے ہیں۔ اصل میں بابا انسانی لاشوں کا تڑپنا دیکھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔41؎ “

”کفارہ“ نامی یہ افسانہ وشنوپربھاکر کا تحریر کردہ ہے۔ جسے مصنف نے 1884ء کے سکھ مخالف فسادات کے پس منظر میں لکھا ہے اورساتھ ہی ساتھ افسانہ نگار نے اس میں ہمیں واقعات 1984ء کو بھی دکھلایا ہے۔ اس افسانے میں واقعات کا راوی خود افسانہ نگار ہی ہے جو سکھ مخالف فساد میں اپنے سکھ دوست سرجیت سنگھ کے کنبے کو پنا دینے کی خاطر اپنے گھر لاتا ہے مگرجب فسادی اس کے گھر پر بھی حملہ کردیتے ہیں تو........ ملاحظہ ہوافسانہ کا یہ حصہ:

”جس وقت اس پاگل بھیڑنے میرے مکان پر حملہ کیا اس وقت مجھے اچانک ایسا لگا کہ میں پل بھر میں ۳۳/ سال کی مدت پوری کرکے1947ء میں جا پہنچا ہوں۔ سب کچھ ویسا ہی۔ ہنگامہ کرتے ہوئے پاگل لوگ، کڑوے دھوئیں سے بھرا آسمان، انسانی گوشت کی بدبو سے بوجھل ماحول۔ کبھی اسٹین گن دندناٹھتی اورکبھی طرح طرح کے نعرے گونج اٹھتے۔42؎ “

اورپھر راوی کو اپنے وہ گناہ یاد آتے ہیں جواس نے ۷۴۹۱ء کے تقسیم ہند کے بعد ہونے والے فساد کے دوران اپنے دوست سرجیت سنگھ کے ساتھ کئے تھے۔ جب اس نے اور اس کے دوست سرجیت سنگھ نے ایک مسلمان کا گھر لوٹ کراس گھر کی واحد زندہ بچی 17/ سال کی لڑکی کی عصمت دری کرکے اس کا خون کردیا۔ اورفاتح بہادروں کی طرح گلی سے باہر آئے اور فتح وشجاعت کے نشے میں چورچیختی چلاتی بھیڑ میں شامل ہوگئے۔ شہریوں کی حفاظت کی خاطر تعینات پولیس والے ہاتھوں میں اسٹین گن تھامے اور چہروں کو لوہے کی ٹوپیوں سے ڈھانپے ایسے کھڑے تھے جیسے اعلان کررہے ہوں کہ ہم براکرسکتے ہیں لیکن برا دیکھ نہیں سکتے۔43؎“

لیکن جب افسانہ نگار اوراس کے دوست کو اس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو..........

”ان کے اندر سب کچھ گڈمڈ ہورہا تھا........وہ مسلم لڑکی اور سردار سرجیت سنگھ اور سندپ کھنہ مسلسل بدلتے ہوئے حالات اور پاگل بھیڑجس کا نشانہ تب مسلمان تھے اب سکھ ہیں اور شاید کل...... اور شاید کل........ پھر کل کے بعد آنے والا کل یعنی مسلسل حالات بدلیں گے۔ مقاصد بھی بدلیں گے لیکن آدمی کے اندر سویا ہوا راکشش اسی طرح مسلسل جاگتا رہے گا۔ اپنی بھوک مٹانے کو....... نئے نئے مکھوٹے لگاکر..........۴۴ ؎ “

لیکن قاری کے لیے اس افسانے میں یہ بات تشنہ رہ جاتی ہے کہ جب فسادی سردار سرجیت سنگھ اورسندیپ کھنہ کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور سرجیت سنگھ کی لڑکی سامنے آجاتی ہے تو فسادی کیا کرتیہیں اورکہانی کہاں ختم ہوتی ہے اورانجام کیا ہوتا ہے۔

رضی الدین صدیقی کا تحریر کردہ افسانہ ’بلا عنوان‘ سنہ ساٹھ کے دہے میں احمدآباد میں ہونے والے ہندو مسلم فساد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار غلام رسول ہے۔ جب شہر میں فساد شروع ہوتاہے تواس کا ہندودوست مہندر اس کے پاس آتا ہے اوراس سے کہتاہے:

”غلام رسول بھائی جلدی یہاں سے بھاگ چلو، بلوائی لوگ ادھر ہی آرہے ہیں۔ نہ معلوم کیا ہوجائے۔ فوراً بھابھی اوربچوں کو لے کر میرے ساتھ چلو۔ یہاں رہنے میں خطرہ ہے۔ جس حال میں ہواسی حال میں نکل چلو۔ ذرابھی دیرکی تونہ معلوم کیا ہوجائے گا۔45؎ “

اور پھر غلام رسول اپنے ہندودوست مہندر کے ساتھ اس کے گھر آتاہے جہاں مکان کے تیسری منزل والے حصے میں اسے اوراس کے کنبے کو چھپادیا جاتاہے۔ مکان کے اس حصے سے اس کااپنا گھر بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد غلام رسول کیا دیکھتا ہے: ملاحظہ ہو افسانہ کا یہ حصہ:

”غلام رسول کے دیکھتے ہی دیکھتے بلوائیوں کا ہجوم اس کے مکان میں داخل ہوگیا..... اب بلوائی اس کے گھر سے سامان لے کر نکل رہے تھے۔...... وہ مجبور تھا سوائے صبر کے اور کچھ نہ کرسکتا تھا۔ لیکن صبر کا دامن تار تار ہوگیا جب اس نے انہونی بات دیکھی........ اس کااپنا دوست، لنگوٹیایار، اوم پرکاش، اس کے گھر سے اس کی بیوی کے کپڑے سینے کی مشین اٹھائے باہر نکل رہا تھا۔ اس کا لڑکا ستیش اس کا ٹرانزسٹر لے کر ایک طرف بھاگا اور اس کا دوسرا لڑکا مہیش اس کی سائیکل اٹھائے باہر آیا اورایک طرف لے چلا۔ غلام رسول زیادہ نہ دیکھ سکا۴۶؎“

اور کئی ہفتے بعد جب حالات معمولات پر آجاتے ہیں تو غلام رسول اپنے گھر کا جائزہ لینے پہنچتا ہے۔ اپنے مکان کے پاس کھڑا ایک ٹک اسے دیکھ رہا ہے کہ اسے آواز آتی ہے۔

”غلام رسول بھائی کیسے ہو غلام رسول بھائی۔“

اوم پرکاش نے قریب آکر اس سے سوال کیا۔

لفظ بھائی پر غلام رسول کو دل ہی دل میں ہنسی آگئی۔ اوم پرکاش ہمیشہ اسے غلام رسول بھائی کہتا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ زور سے قہقہہ لگائے۔ لیکن اس کی زبان بند تھی۔ اوم پرکاش نے اس کا ہاتھ پکڑلیا اوراپنے گھر کی طرف لے چلا۔ اس نے سوچا آج موت یقینی ہے۔ وہ رک جانا چاہتاتھا لیکن قدم رکھتے نہ تھے۔ اوم پرکاش سیدھا اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

غلام رسول بالکل خاموش تھا۔ صرف یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ اوم پرکاش کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ اتنے میں اسے اوم پرکاش کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ غلام رسول بھائی جب محلے پر حملہ ہوا تو مجھے سب سے پہلے تمہارا خیال آیا۔ بلوائی ایک دم محلے پر ٹوٹ پڑے تھے میں اگر چاہتابھی تو تمہارا گھر نہیں بچاسکتا تھا۔ میرے لئے ایک ہی راستہ تھا بلوائیوں کے ساتھ بلوائی بن کر جاتا اورمیں نے یہی کیا۔ میں اور یہ تمہارے دونوں بھتیجے بلوائیوں کے ساتھ تمہارے گھر میں گھس گئے اور جتنا بھی ممکن ہوسکا ہم تمہارا سامان اپنے گھر لے آئے۔مگر افسوس کہ ہم تمہارا سب سامان نہ بچاسکے......“ اوم پرکاش کی آواز رندھ ہوگئی۔

غلام رسول کی نظریں اوم پرکاش پر جمی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے گنگاجمنی بہہ رہی تھی۔ اتنے آنسوتھے اس کی آنکھوں میں کہ اسے صاف نظربھی نہیں آرہا تھا کہ اس کے سامنے کون کھڑا ہے؟.....پنجابی ہے؟ یا ہندو ہے؟ یا بلوائی ہے؟ انسان ہے؟ یا کوئی فرشتہ؟47؎ “

اور افسانہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ اس درندہ صفت زمانے میں انسانیت کی حفاظت کرنے والے بھی موجود ہیں اور ہمیشہ آنکھ جو دیکھتی ہے ضروری نہیں کہ وہ سچ بھی ہو۔

مہدی ٹونکی کی کہانی ”جو لوٹ کر واپس نہیں آئے“ ان لوگوں کی کہانی ہے جو فساد شروع ہونے سے قبل اپنے گھروں سے نکلتے تھے اورفساد کی نذر ہوکر پھر کبھی واپس نہیں لوٹے۔ اس افسانے میں فساد کی ہولناکیاں اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ موجود رہیں۔ ملاحظہ ہواس افسانہ کا یہ حصہ:

”فسادیوں کے ہلّہ بولنے کی یہ آوازیں، زخمیں لوگوں کی چیخیں، گھروں میں بند لوگوں کے دلوں کو دہلائے دے رہی تھی۔ ایک درندہ بھیڑ ایک گھر کو تباہ کرتی تو دوسری درندہ بھیڑ دوسرے گھر کو نیست و نابود کرنے پہنچتی۔ گھر کا دروازہ تورا جاتا۔ فسادی دیواریں کود کر صحن میں پہنچتے۔ وہ گھر کے افراد پر ایسے جھپٹتے جیسے بھیڑئیے ہوں۔ ہتھیاروں سے لیس ان کے ہاتھ اپنے شکار کی طرف ریچھ کی طرح چیرنے پھاڑ نے کو

لپکتے۔ بے بس افراد ان سے بچنے کے لیے ایسے ہی بھاگتے جیسے شکاری سے بچنے کے لیے زخمی پرندہ۔ پھر سر پھٹتے، گردنیں کٹتیں، سینے اور پیٹ میں سوراخ ہوتے زمین پر گرتے ہوئے لوگوں کی چیخیں پڑوسیوں کے دل ہلادیتیں۔ لٹیرے لپ پانی زبانیں لیے عورتوں کی طرف بڑھتے۔ جوان عورتیں، لڑکیاں چیختیں، دھاڑیں مارتیں اِدھر سے اُدھربھاگتیں لیکن ان کے جسم وحشت ناک قہقہوں اور ہوس ناک نظروں میں پھنس جاتے اور پھڑپھڑانے لگتے۔ پھر ان کے برہنہ جسم، پھٹے لباس، فرش پر ڈھیر ہوجاتے۔ پسینے میں تربتر بچے کونے میں منہ دئے کانپتے ہوتے۔ وحشی انھیں بھی ایک ایک وار میں خون سے نہلادیتے جب یہ گھر تاراج ہوجاتا تو پھر یہ درندے دوسرے گھر کی طرف رخ کرتے۔48ـ“

غرض پورا افسانہ فساد کے مہیب سائے میں ڈوبا ہوا ہے۔ اوران لوگوں کا ماتم ہے جو فساد کی بھینٹ چڑھ گئے اور لوٹ کر واپس نہیں آئے۔

افسانہ ”دوسری ہجرت“دور جدید میں بہار کی مشہور افسانہ نگار ’ذکیہ مشہدی‘ کا تحریر کردہ ہے۔ افسانہ یوں تو بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہوئے فرقہ وارانہ فساد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ تاہم اس میں واقعات 1947ء کا بھی تذکرہ ہے اور وجود’بنگلہ دیش‘ کا بھی۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان ہجرت کرنے والوں کا تذکرہ بھی ہے۔ اورفرقہ وارانہ فسادات کے سبب اپنا گھر بار چھوڑکر اپنے ہی ملک میں کسی اورجگہ ہجرت کرجانے کا بیان بھی۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ”معراج“ ہے۔ جب شہر میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑتاہے تو اس کا جگری دوست اوم پرکاش اس سے کہتا ہے:

”یار مجھے اپنی فکر نہیں۔ اتنے تشدد پر لوگ آمادہ نہیں ہوں گے کہ مجھے ماردیں۔ لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ ہجوم سے میں تمہاری حفاظت نہ کرسکوں...... بیس آدمی مجھے پکڑکر ہاتھ باندھ کر ایک طرف کو ڈال سکتے ہیں۔ تم اپنے کسی محلے میں شفٹ کیوں نہیں ہوجاتے ہو۔49ـ“

اس پر معراج کا جوا ہے:

”کیا یہ محلہ میرا نہیں؟ اپنے ہی ملک کی اس زمین پر میرا حق نہیں ہے؟ وہ حصہ جو میرے نام سے رجسٹرڈ ہے جس پر میرے نام سے میری کمائی کا مکان بن کر کھڑا ہوا ہے۔50ـ“

لیکن اوم پرکاش اسے سمجھاتاہے:

معراض اچانک یہ علاقہ بہت زیادہ حساس ہوگیا ہے۔ جذباتی بننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تحفظ سب سے اوپر ہے۔ جان پر آبنتی ہے تو آئیڈیالوجی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔51ـ“

اور معراج حالات پرسکون ہونے کے بعد مسلم محلے میں مکان کی تلاش میں پہنچتا ہے تو وہاں کا ایک مقامی فرد کچھ اس طرح سے اس پر طنز کرتاہے:

”اب کی فساد میں کالونی والوں کا بخار چھوٹ گیا۔ ساری صاحبیت نکل گئی۔ دھڑا دھڑ ہمارے گندے محلے کی زینت بڑھارہے ہیں۔ 52ـ“

ایسے میں معراج کو اپنی اماں کی کہی ہوئی وہ تمام باتیں یاد آرہی تھیں جو وہ ”تقسیم ملک“ کے بعد لوگوں کی ہجرت سے متعلق بتاتی تھیں۔

تمہارے چچا پکے مسلم لیگی تھے۔ مگر تمہارے ابّا خدا بخشے کبھی ان سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اٹھتے بیٹھتے وہ مجھ سے کہتے۔ اے چھوٹی دولہن مگان پکڑ کے تو جب بیٹھو گی جب لوگ تمھیں زندہ رہنے دیں گے۔ کیا غضب کی مار کاٹ مچی ہے۔53ـ“

اور ابّا ”آخر تک تمام جانے والوں کے نام پر تبرّا پڑھتے رہے تھے۔ 1971ء میں بنگلہ دیش وجود میں آیا تو انھوں نے میز پر مکّا مارمار کر لکچر دیا۔”دیکھ لیا نا، دیکھ لیا دوقومی نظرئیے کا انجام۔ اور بھاگو نواب زادوں، حرام زادوں، صاحبزادوں کے پیچھے جنھیں اپنا اقتدار عزیز تھا غریب مسلمان نہیں۔ 54ـ“

مگر معراج میاں

”اللہ آمین، جو یہ سارے قصے سن کر سن کر بڑے ہوئے، ہوش سنبھالا تو اپنے مسلمان ہونے کا مطلب سمجھ میں آیا خاصا تکلیف دہ تھا۔ پھر پاکستان کا مطلب سمجھ میں آیا جو اور زیادہ تکلیف دہ تھا۔ 55ـ“

اور بالآخر معراج ٹرک پر اپنا سارا سامان لادے مسلم محلے میں تحفظ کی خاطر ہجرت کر رہا ہے اور:

”ٹرک نے سارے سامان کو یوں نگل لیا تھا کہ جیسے المیے خاندانوں کو نگلا کرتے ہیں۔ 56ـ“

ان افسانوں کے علاوہ فسادات کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانوں میں اقبال مجید، سریندر پرکاش، حسین الحق، شموئل احمد، احمد ہمیش، منشایاد، زاہدہ حنا، غذرا عباس، اور ڈاکٹر یوسف کے افسانے اہم اور قابل ذکر ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات برصغیر کا ایک ایسا ناسور ہے جس کے بارے میں یہ بات صد فیصد درست معلوم ہوتی ہے کہ ”مرض بڑھتاگیا جوں جوں دواکی“ ۔ لہٰذا آنے والے دور میں بھی اس المیے کوافسانہ نگار نے اپنے فن کا موضوع ضرور بنائیں گے اوراردو کا افسانوی ادب اسے اپنے دامن میں سمیٹ لے گا۔

عنایت اللہ انصاری

اردو ڈپارٹمنٹ
آر، بی، جی، آر ۔ کالج
مہراج گنج، سیوان، بہار

حوالہ جات

1-	نیا ہندوستان، رجنی پام دت، مترجم کلیم اللہ	ص:674
2-	مسلمانوں کا روشن مستقبل، سید طفیل منگلوری	ص:231
3-	کمپنی کے عہد کی تاریخ و تعلیم، میجر باسو	ص:147
4-	مسلمانوں کا روشن مستقبل، سید طفیل منگلوری	ص: 260
5-	ایضاً	ص:673
6-	ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات، بسمبھرناتھ پانڈے	ص:24
7-	اردو شاعری کا سماجی پس منظر، غلام حسین ذو الفقار	ص:115
8-	تاریخ تحریک آزادی ہند، ڈاکٹر تارا چند	ص:312
9-	اردو ادب کے تیرہ افسانے ، اطہر پرویز	ص:11
10-	جدید ادب، محمد حسن	ص:
11-	اردو افسانے پر مغربی افسانے کا اثر، ممتاز شیریں	ص:202
12-	اردو افسانہ، سلامت اللہ خاں	ص:171
13-	اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا، رام لعل	ص:49
14-	معیار، ممتاز شیریں	ص:202
15-	حاشیہ آرائی، محمد حسن عسکری	ص:133
16	ایضاً	ایضاً
17-	اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر مہناز انور	ص:63
18-	پشاور اکسپریس، کرشن چند	
19-	ایضاً	ایضاً
20-	اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر مہناز انور	ص:40
21-	معیار تنقید، ممتاز شیریں	ص:131
22-	افسانہ ''بیلا اور بتول'' کرشن چند	
23-	ایضاً	
24-	افسانہ ''شکر گزار آنکھیں'' حیات اللہ انصاری	
25-	نیا افسانہ، سید وقار عظیم	ص:210
26-	معیار، ممتاز شیریں	ص:214
27-	نیا افسانہ، سید وقار عظیم	ص:210
28-	افسانہ''سردار جی''، خواجہ احمد عباس	
29-	ایضاً	
30-	افسانہ ''کالی رات'' عزیز ازحمد	
31-	اردو افسانہ تحقیق و تنقید، انوار احمد	ص:293
32-	نقوش، افسانہ نمبر 1953ء	ص:1019
33-	اردو افسانہ کا ارتقاء، حامد چھپروی	ص: 294
34-	ایضاً	ایضاً
35-	ایضاً	ایضاً

36-	ایضاً	ایضاً
37-	افسانہ گھور اندھیارا، ممتاز ممفتی	
38-	افسانہ ”نیا فرہاد“، احمد ندیم قاسمی	
39-	افسانہ ”فساد“، احمد ندیم قاسمی	
40-	ایضاً	ایضاً
41-	افسانہ ”کفارہ“، وشنو پربھاکر، مطبوعہ ماہنامہ ”حرفِ آخر“ دہلی	1998ء
42-	ایضاً	
43-	ایضاً	
44-	افسانہ ”بلاعنوان“ رضی الدین صدیقی مطبوعہ ماہنامہ شمع دہلی، ماہِ فروری1970ء	
45-	ایضاً	
46-	ایضاً	
47-	افسانہ ”لوٹ کر واپس نہ ائے“ ، مہدی ٹونکی، مطبوعہ ماہنامہ ”نگاردہلی“ ماہ جنوری 1981ء	
48-	افسانہ ”دوسری ہجرت“ ذکیہ مشہدی مطبوعہ ”زبان و ادب دوماہی“ ماہ مئی، جون 1996ء	
49،	50، 51، 52، 53، 54، 55، 65، ایضاً	